یادش بخیر

شکیل صدیقی

تری لحد پہ کھلیں جاوداں گلاب کے پھول

زندگی ایک حقیقت ہے۔

موت اُس سے بھی بڑی اور اٹل حقیقت ہے۔ جو شخص آیا ہے اُس کو جانا ہے۔ کاتبِ تقدیر کا فیصلہ ہے کُلّ نفسٍ ذائقۃ الموت جس پر ہمیں پوری آمادگی سے لبیک کہنا چاہئے، یہی عبودیت کا سارا فلسفہ ہے۔

دنیا میں آنا جانا لگا ہی ہوا ہے، جو لوگ اپنے لیے جیتے ہیں زمانہ انہیں جلد ہی بھلا دیتا ہے، لیکن جو دوسروں میں زندہ رہتا ہے، اس کی زندگی اور موت دونوں جاویداں ہوتی ہیں۔

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آتے ہیں مرنے کے لیے

ڈاکٹر شکیل صدیقی (جنوری ۱۹۵۷ء-ستمبر ۲۰۱۴ء) میرے ہم کار (کولیگ) تھے، ہم دونوں نے ۷/جنوری ۱۹۸۸ء میں کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامی تاریخ میں بطور لیکچرر اپنی ملازمت شروع کی۔ اس سے قبل میں اسی شعبہ میں بطور معاون لیکچرر (Cooperative teacher) کے تقریباً سوا سال گذار چکی تھی۔ ہم دونوں نے ایک ہی دن جوائننگ دی۔ ان دنوں اس شعبہ میں کئی اہم اساتذہ تھے، پروفیسر علی محسن صدیقی، پروفیسر ڈاکٹر محمد صابر، پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد، پروفیسر ڈاکٹر حسن قاسم مراد، ڈاکٹر ذکیہ سلطانہ، ڈاکٹر نصیب اختر وغیرہ۔

ہم دونوں ۷/فروری ۱۹۹۵ء میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوگئے اور ایک ہی دن جوائننگ دی۔ اس کے بعد میری ترقی کا سفر جاری لیکن اُن کا رُک گیا۔ پہلے اپنے والد کی بیماری میں اُنہوں نے اُن کی بڑی خدمت کی، اُن کے انتقال کے بعد اُن کی والدہ بیمار

رہنے لگیں اور شکیل نے ان کی دن رات خدمت کی۔ ماں کی خدمت کرتے ہوئے اس درجہ انہماک اور توجہ کہ سات سال انہی کے پاس سونا، انہیں دوائیں وقت پر پلانا، کھانا اپنے ہاتھ سے کھلانا، ان کے سکون اور صفائی ستھرائی کا خیال رکھنا، ان کی جا و بے جا ضد یں ماننا، بات بے بات ان کے رونے دھونے پر انہیں بچوں کی طرح سمجھانا، بہلانا، یہ سب شکیل نے کیا۔ میں اُن سے کہا کرتی تھی ''آپ نے تو دنیا ہی میں جنت کا سودا کرلیا۔''

اُنہوں نے اپنے والدین پر اپنا کیریئر قربان کر دیا تھا اور یہ گھاٹے کا سودا نہیں تھا۔

شکیل صدیقی جنوری ۱۹۵۷ء میں الہ آباد (یو۔ پی، انڈیا) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد صدیق تھا۔ انہیں میٹرک کے بعد ہی تلاش روزگار میں لگنا پڑا لہٰذا وہ PIA میں ملازم ہوئے اور کچھ کچھ سال کے وقفے سے اپنی تعلیم بھی مکمل کرتے رہے۔ شروع سے ان کی وابستگی اسلامی جمعیت طلبہ سے تھی۔ پی۔ آئی۔ اے میں ملازمت کے بعد اسلامی تحریک کے مزدور محاذ یعنی پیاسی کے بھی متحرک کارکن ہوگئے۔ پیاسی کے تحت ''ہماری آواز'' کے نام سے جو اخبار جاری ہوا، اُس سے شکیل صدیقی کا صحافتی کردار متعین ہوا۔ انہوں نے روزگار کی مشقت کے ساتھ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ انٹر کیا، بی۔ اے کیا اور دوران ملازمت ہی شعبہ اسلامی تاریخ میں ایم۔ اے کے لیے داخلہ لے لیا اور اوّل پوزیشن حاصل کی۔

جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دور میں مزدور یونینوں پر پابندی عائد کردی گئی، مزدور یونین کے راہنما زیرِ عتاب آگئے، شکیل صدیقی بھی ملازمت سے برطرف کر دیئے گئے۔

۱۹۸۷ء میں جب کراچی یونیورسٹی میں تقرریوں کے لیے اشتہار آیا تو شکیل صدیقی نے بھی درخواست دی۔ ۷/دسمبر ۱۹۸۷ء میں ہمارا اسکیشن بورڈ ہوا، میں اپنا یہ انٹرویو کبھی نہیں بھول سکتی کہ میں اپنی بیٹی کی پیدائش کے سلسلہ میں ہسپتال میں داخل تھی، تین دن کی بچی کو گھر چھوڑتے ہوئے میں سجاد کے ہمراہ انٹرویو دینے یونیورسٹی گئی تھی۔ سولہ سترہ اُمیدواروں میں سے میرا اور شکیل صدیقی کا انتخاب کیا گیا اور ہم شعبہ اسلامی تاریخ کے تدریسی عملہ میں شامل ہوگئے، ان دنوں صدر شعبہ، پروفیسر ڈاکٹر محمد صابر تھے۔

مجھے یاد ہے ۱۹۹۲ء اور ۱۹۹۴ء میں ہم دونوں شعبہ اسلامی تاریخ کے طلباء و طالبات کو مطالعاتی دوروں پر لے کر شمالی علاقوں کی طرف گئے تھے۔ میرے ساتھ میرے تینوں بچے بھی تھے۔ ان دونوں سیاحتی دوروں کے دوران جو کہ تین تین ہفتوں پر محیط تھے، میں نے پہلی بار شکیل میں قائدانہ صلاحیتوں کا مشاہدہ کیا۔ وہ کسی کو ناراض ہونے کا موقع نہیں دیتے تھے، ٹور میں شامل تیس سے زائد طلبا و طالبات کو ایک خاندان کی طرح جوڑے رکھتے تھے۔ ہر ایک سے تعلق رکھنا، ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ سفری تاثرات دریافت کرنا، طلبہ کی شکایتوں کا ازالہ کرنا، ہر معاملہ پر کڑی نظر رکھنا، کفایت شعاری کے ساتھ خرچ کرنا، کبھی کبھی کوئی ڈش خود تیار کرنا اور سب کو کھلانا، نظم وضبط، ترتیب و تنظیم کے ساتھ ساتھ تفریح کے مواقع بہم پہنچانا، ان ساری خصوصیات کی وجہ سے طلبہ و طالبات کے

وہ دونوں دورے یادگار تھے۔خود میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔

جس زمانے میں وہ PIA میں تھے،ایک بار ترکی اور ایک یا دو بار عمرے پر بھی گئے تھے،لیکن اُس کے بعد سوائے ان دو مطالعاتی دوروں کے،والدین کی خدمت کے پیشِ نظر وہ شہر سے باہر نہیں نکلے۔

۲۵ر دسمبر ۱۹۹۴ء میں ان کی شادی ہوگئی۔اپنی جوانی میں وہ ایک دراز قد جوان رعنا تھے۔ چھ فٹ سے زیادہ قد، چھریرا جسم، صاف رنگت، تیکھے نقوش، تھوڑی سے پیوستہ چھوٹی سیاہ داڑھی، وہ مردانہ وجاہت کا نمونہ تھے۔ساتھ ہی وہ ایک بلند کردار، شائستہ اور شریف النفس انسان بھی تھے۔انہوں نے ۳۸ سال کی عمر میں والدہ کی پسند سے شادی کی۔اُن کی بیوی رومانہ سے اُن کی دو بیٹیاں جویریہ اور ثوبیہ اور ایک بیٹا قاسم ہے۔تینوں ابھی اسکول اور کالج میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔اپنی بیس سالہ ازدواجی زندگی میں اُنہوں نے اپنے بیوی بچوں کا ہر طرح خیال رکھا۔رومانہ بتارہی تھیں کہ منگل کی رات، جوان کی اپنے گھر میں آخری رات تھی، ایک بجے کے قریب انہوں نے تینوں بچوں کو بلایا اور رات دو بجے تک ان سے خوب باتیں کیں۔اسی دوران انہوں نے اپنے بیٹے قاسم سے کہا،''بیٹے مجھے معاف کردینا میں نے تمہیں بہت ڈانٹا اور مارا ہے۔'' پھر کہنے لگے،''کیا کروں تمہاری ماں تمہاری شکایت جو کرتی تھی۔''

ان کے بچوں اور بیوی کے سر سے وہ شجرِ سایہ دار ہٹ گیا ہے جس نے بیس برس انہیں زمانے کی کڑی دھوپ سے بچا کر رکھا ہوا تھا۔رومانہ کی فرمائشیں پوری کرنا،اس کے لیے شاپنگ کرنا ان کی عادت تھی۔ہم انہیں کبھی کبھی چھیڑا کرتے تھے،

''لوگ اللہ کو پیارے ہوتے ہیں، آپ بیوی کو پیارے ہوگئے ہیں۔''

اُنہوں نے ۲۰۰۵ء میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ان کی تحقیق کا موضوع ''ہندوستان میں علم تفسیر کا ارتقاء'' تھا۔ میں اپنی ڈاکٹریٹ پانچ سال قبل حاصل کرچکی تھی اور ان دنوں صدر شعبہ تھی۔شکیل صدیقی میں پیشہ ورانہ رقابت (Profesional Jealousy) بالکل نہیں تھی۔وہ میری ہر کامیابی پر مبارک باد دینے والے پہلے شخص ہوتے۔معاملہ صرف مبارک باد تک نہ رہتا وہ تمام فیکلٹی کو شامل کر کے ایسے تمام مواقع Celebrate کرتے۔

وہ بہت محنتی، پُر خلوص اور شفیق اُستاد تھے۔طلبہ و طالبات بلا روک ٹوک اور بلا جھجک ان کے کمرے میں رش لگائے رکھتے، وہ سب کی سنتے تھے، سب کے مسائل حل کرتے تھے، وہ طلبہ و طالبات جو معاشی پریشانیوں کا شکار ہوتے ان کی فیس کا بندو بست کراتے، جس زمانے میں نارد اطلبہ سیاست عروج پر تھی، وہ شعبہ کے مشیر امور طلبہ تھے۔یہ بڑا کٹھن اور سخت وقت تھا،لیکن اُنہوں نے اس پیشہ ورانہ ذمہ داری کو خوش اسلوبی سے نبھایا۔تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیتی پہلو پر نظر رکھتے۔ان کی وجہ سے شعبہ میں ایک رکھ رکھاؤ، نظم اور وقار کی فضا قائم رہتی۔

چند سال قبل جب شعبہ کے لیے ایسوسی ایٹ پروفیسر کی آسامی مشتہر کی گئی تو شعبہ کے دو اساتذہ نے درخواست دی، جن میں ایک ڈاکٹر شکیل بھی تھے۔ پھر جامعات کا جو عام چلن ہے اُس کے بہ موجب اسکروٹنی میں ڈاکٹر شکیل کو روک دیا گیا۔ اُس زمانے میں میں صدر شعبہ بھی نہیں تھی تاہم اس کے باوجود ان کے ساتھ ہونے والی اس زیادتی پر مجھے سخت افسوس ہوا۔ جامعات کے معاملات جب یہاں تک پہنچ جائیں کہ ڈین شپ اور وائس چانسلری ''خریدی'' جا سکتی ہو، تقرریاں میرٹ کے بجائے سیاسی بنیادوں پر ہوں تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

۲۰۱۲ء میں جب پروفیسر کی آسامی مشتہر ہوئی تو شکیل صدیقی نے پروفیسر شپ کے لیے درخواست دی۔ یہ وہ وقت تھا کہ میں (تیسری بار) صدر شعبہ بھی تھی۔ میں نے کوشش کی کہ اس بار کسی سطح پر ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو۔ اوائل ستمبر میں وہ پروفیسر بن گئے، اس کے دو ہفتے بعد چل بسے۔ وہ مجھ سے دو سال چھوٹے تھے، ابھی ان کی ریٹائرمنٹ میں دو سال باقی تھے۔

وہ گذشتہ دو برس سے بیمار تھے۔ ابتداء میں ان کا مرض تشخیص نہ ہو سکا، بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ جگر کا کینسر ہے۔ مرض لاعلاج ہے سوائے اس کے کہ جگر کی پیوندکاری کی جائے۔ پاکستان میں علاج نہیں تھا، اس لیے انہیں یا انڈیا جانا پڑتا یا امریکہ۔ ہم سب نے بہت زور دیا کہ وہ اپنا آپریشن کرالیں۔ مجھے یاد ہے میری ان سے آخری جھڑپ اسی بات پر ہوئی تھی۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ اگر آپ Donor کا بندوبست کرلیں، جو آپ کی بہن، بھائی یا بیٹا ہو سکتا ہے، تو کچھ اخراجات یونیورسٹی اٹھالے گی کچھ ہم فنڈ ریزنگ کرلیں گے۔ یہ سنتے ہی انہوں نے بڑی قطعیت سے انکار کر دیا۔ یہ بات ان کے عزت نفس اور غیرت کے خلاف تھی، کہ وہ ہمیں رقم کی فراہمی پر لگا دیں یا اپنے رشتہ داروں سے ایک انسانی عضو کے چھوٹے سے ٹکڑے کی بھیک مانگیں۔ انہوں نے پوری بہادری سے مرض کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

میں نے یوں موت کا خیر مقدم کیا
زندگی میرا منہ دیکھتی رہ گئی

آخری چند ماہ ان کے ایسے گذرے کہ ان کے پیٹ میں پانی بھر جاتا، وہ ہسپتال میں داخل ہو کر پانی نکلواتے، اس سے ان کو کمزوری بھی ہو جاتی، بعض اوقات انفیکشن ہو جاتا جس سے تیز بخار چڑھ جاتا۔ جونہی ان کا بخار اُترتا وہ جامعہ آتے، اپنی کلاس لیتے، ہم سب سے ملاقات کرتے، شعبہ جاتی امور نبٹاتے، تھکنے لگتے تو واپس چلے جاتے۔

جنوری ۲۰۱۴ء میں شروع ہونے والے تعلیمی سال کے موقع پر میں نے ان کی طبیعت کے پیش نظر اُن سے کہا کہ ایم۔ اے فائنل کے پرچے ''مسلمانوں کے سیاسی افکار'' "Muslim Political Thought" اور آنرز فائنل کے پرچے ''سیرۃ رسول اللہ'' میں سے ایک چھوڑ دیں جب طبیعت ٹھیک ہو تو واپس لے لیں۔ اُنہوں نے کہا ''پولیٹیکل تھاٹ آپ پڑھا دیں، سیرۃ میں

ہی پڑھادوں گا۔''

اُنہیں رسول اللہ کی سیرت سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ شکیل کے زیادہ تر مقالات اسی موضوع سے متعلق ہیں۔ ان کی نگرانی میں پی۔ ایچ ڈی کرنے والے طلبہ کے موضوعات بھی بیشتر سیرۃ کے متعلق ہی ہوتے۔

اپنی زندگی کے آخری سال اُنہوں نے Study of Sirah and Research Center کے نام سے ادارہ قائم کیا، ان کا ارادہ تھا کہ اس ادارے کے تحت سیرت کے حوالے سے تحقیقی و تصنیفی کام کریں گے۔ اسی ادارے سے شائع ہونے والی ان کی پہلی اور آخری کتاب روح سیرت تھی۔ یہ ان کے انتقال سے ڈیڑھ دو ماہ قبل کی بات ہے وہ اپنی یہ کتاب مجھے دینے آئے، میں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور مبارک باد دی۔

''پتا نہیں کیا بات ہے'' اُنہوں نے قدرے اُداسی سے کہا ''جیسے جیسے وقت قریب آرہا ہے مجھ میں لکھنے کی ارج بڑھ رہی ہے۔''

میں اندر سے ہل کر رہ گئی۔

''لکھنے کی کوشش تو کرتا ہوں..... لیکن اب زیادہ دیر بیٹھ کر لکھا نہیں جاتا۔''

شکیل کو اپنے مرض کی نوعیت کا اچھی طرح علم تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کی عمر کی نقدی ختم ہو رہی ہے۔ ان کا وجود دھوپ میں رکھی برف کی مانند تھا۔

اب عمر کی نقدی ختم ہوئی — اب ہم کو اُدھار کی حاجت ہے
ہے کوئی جو ساہوکار بنے — ہے کوئی جو دیون ہار بنے؟
کچھ سال، مہینے، دن لوگو — پر سود بیاج کے بن لوگو
ہاں اپنی جاں کے خزانے سے — ہاں عمر کے توشہ خانے سے

لیکن شکیل نے ادھار نہیں لیا۔ اپنی ذات کے لیے اپنے گھر والوں یا احباب کو آزمائش میں ڈالنا، ان کا مزاج ہی نہیں تھا۔

اُس ایک شخص میں پنہاں تھیں خوبیاں کیا کیا
ہزار لوگ ملیں گے مگر وہ شخص کہاں؟

وہ سالہا سال فرائی ڈے اسپیشل کے لیے لکھتے رہے، اگر ان کے وہ تمام مضامین، تبصرے اور کالم وغیرہ جمع کیے جائیں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔ وہ اپنی فکر اور سوچ میں بڑے یکسو تھے۔ جماعت اسلامی سے ان کی وابستگی بڑی گہری تھی، کبھی کبھی میں انہیں چھیڑا کرتی،

''آپ تو مقلد ہیں، عبقری نہیں ہو سکتے۔''

بڑے رسان سے مسکراتے اور عاجزانہ کہتے،

''بھئی میں کب کہہ رہا ہوں کہ آپ سے جیت سکتا ہوں۔''

حالیہ عید (جواُن کی آخری عید ثابت ہوئی) کی چھٹیوں کے بعد شکیل صاحب عید کی مبارک باد دینے میرے کمرے میں آئے۔ مبارک بادیوں کا تبادلہ ہوا، پھر میں نے طبیعت پوچھی، کہنے لگے ''اس سال روزے نہیں رکھ سکا، ایک بار تراویح کو گیا، بیٹھ کر نماز پڑھی، پھر بھی حالت ایسی خراب ہوئی کہ پھر دوبارہ نہیں جا سکا۔''

میں خاموش رہی تو کہنے لگے،

''زندگی میں پہلی بار ہوا ہے کہ نہ روزے رکھ سکا، نہ تراویح پڑھ سکا، نہ شب بیداری کر سکا۔'' ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ستائیس سال کے ساتھ میں میں نے اُنہیں پہلی بار آبدیدہ دیکھا تھا۔ میں نے توجہ ہٹانے کے لیے کوئی اور بات شروع کر دی تو کہنے لگے۔

''دعا کریں کہ اگلا رمضان اس طرح ملے کہ روزے رکھ سکوں..... رسول اللہ کی عمر (۶۳ سال) مل جائے تو.....۔''

وہ زندہ رہنا چاہتے تھے، اور ایسا تو سب ہی چاہتے ہیں، لیکن ان کا وقت تیزی سے قریب آتا محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے شکیل کو آخری بار ۱۸ ستمبر ۲۰۱۴ء کی شام ڈاکٹر شکیل اوج کے جنازے کے موقع پر دیکھا، جب میں شکیل اوج کے گھر میں داخل ہو رہی تھی تو شکیل صدیقی، شکیل اوج کے بیٹوں سے گلے مل کے تعزیت کر رہے تھے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد جب میں واپس جا رہی تھی (ابھی تدفین نہیں ہوئی تھی) تو وہ گھر کے باہر پڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھے نظر آئے۔ مجھے وہ کافی بیمار اور تھکے ہوئے لگ رہے تھے، لیکن وہ محض دس دن کے مہمان ہوں گے، یہ میرے وہم و گمان میں نہیں تھا۔

اس کے بعد وہ صرف ایک دن یعنی منگل کو یونیورسٹی آ سکے، اس دن ڈاکٹر شکیل اوج کے لیے تنظیم اساتذہ کی طرف سے جنرل باڈی میٹنگ تھی، جس میں وہ آخر تک بیٹھے رہے۔ اس دن میں جامعہ نہیں جا سکی تھی۔ ۲۴ ستمبر بروز بدھ وہ ہسپتال میں پھر داخل کیے گئے۔ اس دن میں کلاس لے کر اپنے کمرے میں آئی ہی تھی کہ سہیل شفیق تیزی سے میرے کمرے میں آئے اور بتایا کہ،

''شکیل صاحب کی بیوی کا فون آیا ہے..... وہ بہت رو رہی ہیں..... سر کی طبیعت بہت خراب ہے میں ہاسپٹل جا رہا ہوں۔''

اس سال جولائی سے یہ سلسلہ چل رہا تھا، ان کی طبیعت اچانک خراب ہوتی، ایک بار تو وہ *death Coma* میں چلے گئے تھے، انہیں بھاگم بھاگ ہسپتال لے جایا جاتا، چند دن وہاں داخل رہتے، جونہی طبیعت بہتر ہوتی، یونیورسٹی آ جاتے اور ایک کے بجائے ڈیڑھ گھنٹے کی کلاس لیتے تاکہ طلبہ کا نقصان پورا ہو سکے۔

سہیل تھوڑی تھوڑی دیر پر مجھے *SMS* کے ذریعہ شکیل صدیقی کی حالت سے باخبر کرتے رہے۔ ایک بج کر تیرہ منٹ پر اُن کا پیغام آیا کہ شکیل صدیقی صاحب کو *Ventilator* پر شفٹ کیا جا رہا ہے، انہیں دعاؤں کی ضرورت ہے.....۔

میرا دل بیٹھ گیا، انہیں برین ہیمبرج بھی ہو گیا تھا، ایک دن رات میں انہیں چالیس بوتلیں خون کی چڑھائی گئیں۔ میں جب انہیں دیکھنے ہسپتال گئی تو وہ آغا خان ہسپتال کے CCU کے کمرہ نمبر A-12 میں آرام دہ ٹھنڈے اور پُرسکون کمرے میں اس

طرح کروٹ کے بل لیٹے تھے کہ جسم کے ساتھ مشینیں، ناک اور منہ میں نلکیاں، ہاتھ میں کینولا لگا ہوا تھا۔ دل کی دھڑکن مانیٹر کرنے والی مشین صاف بتا رہی تھی کہ دل کو زبردستی دھڑکنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ دو دفعہ دل دھڑکتا پھر ایک وقفہ آجاتا، پھر دو دفعہ کی دھڑکن پھر وقفہ..... مصنوعی تنفس کا سلسلہ چل رہا تھا۔

وہ تین دن مزید اسی حالت میں رکھے گئے اور ہفتہ کی دوپہر یہ مصنوعی سلسلے بھی ختم ہو گئے۔ اتوار کے دن رفاہ عام سوسائٹی، ملیر کے قبرستان میں ان کی تدفین ہوئی، ان کا جنازہ بہت بڑا تھا، ہزاروں افراد ان کی نمازِ جنازہ میں شریک ہوئے۔ ہر دل اُداس تھا اور ہر آنکھ اشک بار

ع بقدر پیمانۂ تعلق ہر ایک دل میں تھا سوگ تیرا

انتقال سے محض دو ہفتے قبل وہ پروفیسر ہوئے تھے۔ بحیثیت پروفیسر ان کا ملازمتی شناختی کارڈ، ان کے انتقال کے بعد تیار ہو کر شعبہ میں آیا۔ میں نے ان کے جس آخری کاغذ پر دستخط کیے تھے وہ یہی کارڈ کا فارم تھا۔

میرا ان کا ستائیس سال کا ساتھ تھا۔ ابھی ان کی سکدوشی میں دو سال باقی تھے کہ بلا لیے گئے۔

جب میں ڈاکٹر شکیل صدیقی کو مرض سے نبرد آزما دیکھتی تھی تو سوچتی تھی کہ یہ تو سب کو پتہ ہے کہ ہر شخص جو آیا ہے اُسے جانا ہے، لیکن کون کس طرح جائے گا، یہ انکشاف بڑی دیر سے ہوتا ہے، شکیل کو اپنے مرض کی نوعیت کا علم تھا، اُنہیں یہ بھی معلوم تھا کہ زندگی کی مہلت کم رہ گئی ہے۔ ''نگار میرے حصّے میں بڑا عجیب مرض آیا ہے.....'' ایک بار اُنہوں نے مسکرا کر مجھ سے کہا تھا، مگر اُن کی مسکراہٹ میں غضب کی بے بسی تھی۔ اور میں یہ سوچنے لگی تھی کہ خدا جانے میرے حصّے میں کیا آنے والا ہے۔